نازیہ کنول
پی ایچ۔ڈی اسکالر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز،اسلام آباد
عثمان غنی
سینیر انسٹرکٹر اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئج، اسلام آباد

ستر کی دہائی کا افسانہ: فکری و اسلوبیاتی جائزہ

In Pakistani short story the decade of seventy is the most important because that was the era of totaly afraidness of martial law, dangean condition in all politics and society was in under the pressure of problem.There is an old saying that literatuis written in the reflect of act of society.Therefore, in this decade the short story was the most powerful type of literature to express all impression and emotions.Most prominant short story writers of this decade are " Intizar Hussain, Anwer Sajjad, Khalida Hussain , Rasheed Amjad , Masood Asher, Mansha Yaad, Ejaz Rahi, Ahmed Javed, Asad Muhammad Khan, Ahmed Dawood and Mirza Hamid Baig.

زمانی تاثر دنیا کے ہر آدمی پر یکساں اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں سمیت نازل ہوتا ہے۔مگر کچھ حالاتِ حاضرہ سے اس لیے بچ نکلتے ہیں کہ ماضی میں ان سے کسی نہ کسی طور ایسا ہو چکا ہوتا ہے۔مگر کچھ لوگ اس زمانی تاثر کو من و عن تسلیم کر کے دور اندیشیوں کے زعم میں مبتلا ہو کر اچھے مستقبل کی امید باندھ کر تسلیم و رضا پر اکتفا کرتے ہیں۔چاہے کچھ بھی ہو، کچھ لوگ اپنی فطرتِ ثانیہ سے مجبور اپنی بصیرت و دانش مندی کی آنکھیں ہر وقت وا رکھتے ہیں۔زمانہ جیسی کروٹ لے گا،جس بھی رُخ پر مچلے گا،جس پہلو پر بھی زور دے گا یہ لوگ اسے پرکھیں گے،جانچیں گے اور برملا اس کا اظہار کریں گے۔یہی لوگ زمانے اور معاشرے کے نباض اور عکاس ہوتے ہیں جوبعد میں حکیم الزمانہ بن کر ابھرتے ہیں۔انھی کو ادیب،شاعر اور مفکر کہتے ہیں۔قیام پاکستان کے بعد اردو افسانے میں نئے رجحانات پیدا ہوئے اور ۱۹۶۰ء کے بعد جدید افسانے کا رجحان شروع ہوا۔ساٹھ کی دہائی میں پاکستانی معاشرہ سماجی وسیاسی دونوں لحاظ سے الجھنوں کا شکار رہا۔سیاسی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ دور قومی شناخت کی گمشدگی کا دور نظر آتا ہے۔پاکستانی معاشرہ مارشل لاء کے نفاذ سے غیر مستحکم سیاسی صورتحال کا شکار ہوا۔اس صورتحال سے معاشرہ سماجی، سیاسی اور فکری مسائل کا شکار ہوا۔یہ وہ دور تھا جس میں ادیبوں اور خصوصاً افسانہ نگاروں نے فوجی آمریت کے خلاف اپنے قلم کے زور سے آواز بلند کی اور اس مقصد کے لیے انھوں نے علامتی واستعاراتی پیرایہ اختیار کیا۔

افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں سیاسی جبر وگھٹن اور نفسیاتی وذہنی عوارض کی عکاسی کی ہے۔اس دور کے افسانوں کا رجحان علامتیت ہے۔جدید نسل کے افسانہ نگاروں کی تحریریں معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ان کی تحریروں میں حالات کے سبب بڑی بے چینی اور گھٹن دکھائی دیتی ہے۔اس عہد میں جدید رجحان کو اپناتے ہوئے جن افسانہ نگاروں نے سیاسی اور سماجی حالات سے بغاوت کی اور اس صورتحال کو بڑی خوبی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔جدیدیت نے اردو افسانے میں فنی وفکری سطح پر انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔جدید رجحان کے تحت لکھنے والوں میں انتظار حسین، انور سجاد، خالدہ حسین، رشید امجد، مسعود اشعر، منشا یاد، اعجاز راہی، احمد جاوید، اسد محمد خان، احمد دائود اور مرزا حامد بیگ نے اپنے افسانوں میں ابتر پاکستانی معاشرے کی سماجی وسیاسی صورتحال کو علامتیت کا سہارا لے کر بڑے خوبصورت انداز میں بے نقاب کیا ہے۔

انتظار حسین:

انتظار حسین نے اپنے فن کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں کیا۔ساٹھ کی دہائی میں لکھنے والوں میں آپ ایک معتبر نام تھے۔آپ کے ابتدائی افسانے ہجرت اور تقسیم ہند سے متعلق ہیں۔ان افسانوں میں انھوں نے تقسیم سے ہونے والے مسائل کے شکار افراد کی ذہنی اور معاشرتی سطح کی عکاسی کی ہے۔قیوما کی دکان، اجودھیا، ایک بن لکھی رزمیہ، مایا اور کنکری اس حوالے سے ان کی قابل ذکر تحریریں ہیں۔

> انتظار حسین اردو افسانے میں منفرد حیثیت کے حامل افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنی کہانی لکھتے ہوئے کبھی علامت، کبھی استعارے، کبھی تحریر اور کبھی اساطیر کا سہارا لے کر کہانی کو ہمہ جہت بناتے ہیں۔ان کے افسانوں میں انکشاف حقیقت یک تہی نہیں ہے۔ان کے یہاں انسان کے وجود کی مختلف تہیں منکشف ہوتی ہیں اور محض اس طرح مکمل شعور ذات ممکن ہے۔ روحانی زوال کی ایک نشانی یہ بھی ہے۔(۱)

انتظار حسین کا اعلیٰ ترین افسانہ "زرد کتا" ہے۔موضوع کے لحاظ سے "زرد کتا" اور "آخری آدمی" ایک ہی طرز پر لکھے گئے بہترین افسانے ہیں۔دونوں کہانیوں میں نفسانی کشمکش اور انسانی قدروں کی زوال پذیری دکھائی گئی ہے۔مماثلت کے باوجود "زرد کتا" کی تکنیک اور اسلوب آخری آدمی سے مختلف ہیں۔انسان کے نفس کو "زرد کتا" کہا گیا ہے جو اسے اکسا کر سفلیت کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے اور لالچ اور طمع میں مبتلا کر دیتا ہے۔"زرد کتا" ایک سبق آموز کہانی ہے۔ جس میں بھلائی وبرائی کو علامتی وتمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ہڈیوں کا ڈھانچ اور ٹانگیں خوف، بھوک اور لالچ جیسے موضوعات پر مبنی کہانیاں ہیں۔"ٹانگیں"، "زرد کتا" کی طرح کا موضوع ہے لیکن انتظار حسین نے اس میں طریقہ کار بالکل مختلف نوعیت کا اپنایا ہے۔

"کایا کلپ" اور "سوئیاں" یہ وہ علامتی افسانے ہیں جو خوف کی نفسیات کو ظاہر کرتے ہیں۔انتظار حسین نے ان افسانوں میں وجودیت کی اس فکر کی عکاسی کی ہے کہ انسان وہی بن جاتا ہے جو وہ بننا چاہتا ہے۔انتظار حسین نے تمثیل کاری

کے ذریعے وجودیت کی فکر کو ابھارا ہے۔انتظار حسین نے اپنے عہد کے جبر واستحصال کو اپنے چوتھے افسانوی مجموعے "شہر افسوس" کی کئی کہانیوں میں بیان کیا ہے۔ان کہانیوں کا موضوع اس عہد کے سیاسی وسماجی حالات کے پیش نظر سامنے آنے والے کربناک واقعات ہیں۔انتظار حسین ایک متحرک ذہن کے مالک ہیں۔انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں علامتی اظہار کے لیے جس اسلوب اور تکنیک کا استعمال کیا ہے۔اس نے انھیں صف اول کے افسانہ نگاروں میں لا کھڑا کیا ہے۔انتظار حسین نے روایتی اسلوب کی بجائے داستانی اسلوب اختیار کیا۔ان کے ہاں موجود نئی علامتیں اور کردار داستانوی یا اساطیری رنگ لیے ہوئے ہیں۔انتظار حسین نے اپنے ہر تمثیلی اسلوب کے ذریعے اردو افسانے کو ایک نیا رنگ دیا اس حوالے سے "گوپی چند نارنگ" رقمطراز ہیں:

> انتظار حسین کا تمثیلی اسلوب مکالماتی بنت اور معاشرتی فضا سازی ایسی زبردست انفرادیت لیے ہوئے ہے کہ انھیں نا کسی کا مقلد کہا جا سکتا ہے نہ کس سے متاثر۔[۲]

انتظار حسین کے بارے میں بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ اپنے اسلوب، ہیئت اور موضوعات کے لحاظ سے بلاشبہ دور جدید کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔

انور سجاد:

علامتی افسانہ لکھنے والوں میں ایک معتبر نام انور سجاد کا بھی ہے۔انور سجاد نے بھی ساٹھ کی دہائی میں لکھنا شروع کیا تھا اور وہ انتظار حسین کے ہم عصر تھے۔اگرچہ یہ دونوں افسانہ نگار ایک ہی زمانے میں لکھا کرتے تھے۔لیکن پھر بھی دونوں کا انداز تحریر ایک دوسرے سے الگ تھا۔علامتی افسانے کے جدید دور کا آغاز انور سجاد سے ہوتا ہے۔ان کی وجہ سے ادیبوں نے اپنی بات کہنے کے لیے علامات کا سہارا لیا۔انور سجاد ترقی پسند سوچ کے حامل تھے۔انھوں نے علامات کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔انور سجاد نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی رویوں سے گہرا اثر قبول کیا۔جس کا اظہار ان کے افسانوں میں بکثرت نظر آتا ہے۔ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں:

> انور سجاد نے اپنے عہد کے سیاسی جبر کے کریہہ المنظر چہرے کو بے نقاب کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور اپنی کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ان کے افسانوں میں ظلم وجبر اور استحصال کرنے والی قوتوں سے ٹکرا جانے کا عزم، نئے سورج کا انتظام اور نئی دنیا کی تلاش کا رویہ ملتا ہے۔[۳]

انھوں نے سیاسی جبریت وگھٹن، معاشی ناہمواری کا احساس اور معاشرتی سطح پر ہونے والے استحصال کو اپنے افسانوں میں موضوع بنایا۔"چوراہا"ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے کی کہانیوں میں روایت اور جدت دونوں پہلو نمایاں ہیں۔اگرچہ ابتداء میں ان کا اسلوب بیانیہ رہا۔لیکن جلد ہی ان کا اسلوب علامت واستعارہ سازی کے روپ میں ڈھل گیا۔"استعارے" کی کہانیاں ہی جدیدیت کے حوالے سے انور سجاد کی اصل پہچان بنیں۔انور سجاد نے اپنے افسانوں میں علامتی واستعاراتی انداز اختیار کیا۔انھوں نے اپنے افسانوں میں خوف، جبر، اجنبیت اور تنہائی جیسے

عناصر کو بنیادی استعارے کے طور پر استعمال کیا۔یہ استعارے کبھی فرد اور کبھی معاشرے کے طور پر نظر آتے ہیں۔انور سجاد نے اپنے افسانوں میں فرد کے خوف، قدروں کا مٹنا یا زوال پذیر ہونا اور اپنے عہد کے جبر کو استعاراتی اسلوب میں پیش کیا۔ان افسانوں میں سیاہ رات، پتھر لہو کتا، دوب ہوا اور لنجا کیکر، سازشی، چھٹی کا دن، سونے کی تلاش، پرندے کی کہانی، روانگی وغیرہ میں استعاراتی وتجریدی اسلوب نمایاں ہے۔انور سجاد کے افسانے منفرد حیثیت رکھتے ہیں ان کے اسلوب کا نیا پن جدید انسان کی فکری صلاحیت کا نتیجہ ہے۔انھوں نے استعارے، تجرید اور علامت کو صرف فنی تجربے کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ یہ ان کی فطری صلاحیتوں کا اظہار ہے۔

خالدہ حسین:

خالدہ حسین علامت سازی کو موثر انداز میں پیش کرنے والوں میں ایک اہم نام ہیں۔ساٹھ کی دہائی کیبعد منظر عام پر آنے والے افسانہ نگاروں میں سے ایک اہم نام خالدہ حسین کا ہے۔خالدہ حسین نے علامت، سریل ازم، وجودیت اور استعاراتی انداز اختیار کرتے ہوئے افسانہ نگاری کی ابتداء کی۔خالدہ حسین نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی مسائل، ادب، تاریخ اور انسانی اقدار کی تنزلی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر پیش کیا۔خالدہ حسین جدید افسانے کی تاریخ کا وہ نمایاں نام ہیں جن کے ذکر کے بغیر افسانے کی تاریخ نامکمل اور ادھوری ہے۔ادب لطیف سے انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔خالدہ حسین کے افسانوں میں زندگی کی معنویت، تنہائی، شکست اور موت جیسے احساسات شدت سے نظر آتے ہیں۔خالدہ حسین کے افسانے تجریدت پر مبنی ہیں۔ان کا انداز بیانیہ ہے ان کے موضوعات عام زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔زندگی کی حقیقتیں اور ان حقیقتوں سے جڑے مسائل کو سامنے رکھ کر ہی وہ اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتی ہیں اور انھیں اسی شکل میں پیش کر دیتی ہیں۔بقول رشید امجد:

> خالدہ کی کہانیوں میں سماجی سیاسی عمل جس طرح ذات کا حصہ بنتا ہے اور کہانی خارجی حقیقت نگاری کے باوجود گہرا علامتی اور اشاراتی رنگ اختیار کر لیتی ہے اس کا بنیادی نقطہ خالدہ کا محسوساتی کشف ہے جو ان کی کہانیوں میں تازہ لہو کی طرح دوڑتا ہے اور انھیں تروتازہ رکھتا ہے۔[۴]

خالدہ حسین کا پہلا افسانوی مجموعہ "پہچان" ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔"ایک بوند لہو کی"،"منی"،"آخری سمت"،"سواری"، ہزار پایہ"،"ایک رپورتاژ"،"پہچان"،"سایہ اور پرندہ" اس مجموعے میں شامل اہم افسانے ہیں۔خالدہ حسین نے اس مجموعے میں عورت کی مظلومیت، بے بسی، عدم تحفظ اور سیاسی وسماجی گھٹن کو علامتی وتجریدیشکل میں واضح کیا ہے۔ان کے افسانوں کا موضوع حیرت ہے اور حیرت ہی ان کے افسانوں کا بنیادی استعارہ ہے۔انہوں نے صوفیانہ طرز تحریر اختیار کیا۔زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے بڑے خوف، معاشرتی ڈر، یقین و بے یقینی جیسے عوامل یہ سب ان کے افسانوں میں وجودی رویے ہیں۔ایک طویل غلامی کے بعد آزادی کا سورج ایک دردناک صبح کی طرح ظہور پذیر ہوا۔اس نے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا پھر ہجرت کا دکھ، فسادات کے نتائج اتنے درد ناک تھے کہ اس نے بھی ادب کو بہت متاثر کیا۔

پھر نئی مملکت کا قیام اور حکومتوں کی تبدیلیاں پھر رہی سہی کسر مارشل لاء نے پوری کر دی۔اس صورتحال نے لکھنے والوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔حالات کی ستم ظریفی نے ادباء کو متاثر کیا اور ذات کی گمشدگی کے احساس نے جنم لیا اور یوں افسانے نے ایک نئی کروٹ لی اور خالدہ حسین کا تخلیقی سفر اس نئے عہد کا ترجمان بن گیا۔انھوں نے قرآن اور بزرگان دین کے واقعات اور ملفوظات کو علامتی انداز میں نہایت ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا۔اپنے وجود کی حقیقتوں کی تلاش ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ان کے افسانوی کردار ایک پر سرار دہشت اور ڈر وخوف کا شکار نظر آتے ہیں۔خالدہ حسین کے افسانوں میں یقین وبے یقینی، ڈر اور خوف کا احساس علامتی انداز میں نظر آتا ہے۔خالدہ حسین نے اس المیاتی صورتحال کو کئی بار اپنی ذات کے حوالے سے بھی پیش کیا ہے۔

رشید امجد:

رشید امجد موجودہ عہد کے ایک قابل قدر افسانہ نگار ہیں۔رشید امجد نے اپنے فنی سفر کا آغاز ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کیا۔یہ وہ دور تھا جب افسانوں کے موضوعات میں تبدیلی رونما ہوئی اور لکھنے والوں نے جدیدیت کے حوالے سے لکھنا شروع کیا۔جدیدیت کے حوالے سے لکھنے والوں میں ایک اہم نام رشید امجد کا بھی ہے۔یوں تو رشید امجد کے موضوعات لامحدود ہیں۔انھوں نے سیاست، معاشرت، معیشت، مذہب واخلاق، نفسیات اور ادب کو اپنے افسانوں میں نہایت کمال سے پیش کیا۔جدیدیت کے حوالے سے بھی ان کے افسانے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ماحول کی تلخی، افسردگی اور بے چینی کو انھوں نے محسوس کیا۔یہ واقعات وحالات ایک حساس انسان کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھے۔ رشید امجد نے اس صورتحال کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی۔اس صورتحال نے ان کی ادیبانہ سوچ پر گہرا اثر ڈالا۔اس کے بعد جمہوری آزادیوں کی تحریک، یحییٰ کا مارشل لائی، سقوط ڈھاکہ، جلائو گھیرائو، بھٹو کی پھانسی اور ضیاء الحق کا مارشل لاء ان تمام واقعات نے سماج کے ہر فرد کو متاثر کیا اور ہر طرف بے چینی اور اضطراب کی فضا پھیل گئی۔ان حالات وواقعات نے ادب کو بہت متاثر کیا۔رشید امجد کے لیے یہ سانحہ بہت بڑا تھا۔جس کا اظہار انھوں نے اپنے افسانوں میں بڑی خوبصورتی سے کیا۔رشید امجد کی علامتی تحریروں نے اردو افسانے کی پوری ماہیئت ہی تبدیل کر ڈالی۔رشید امجد کا علامتی انداز تحریر ان کا منفرد تشخص قائم کرتا ہے۔بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> صحیح معنوں میں علامتی افسانے لکھنے کے سلسلے میں سب سے اہم نام رشید امجد کا ہے۔[۵]

رشید امجد نے جو علامتی کہانیاں لکھیں وہ ہمارے سیاسی حالات اور عہد استبداد کی آئینہ دار ہیں۔انھوں نے ضیاء کے مارشل لائی دور میں علامت کو اظہار کا وسیلہ بنا کر سیاسی ومعاشرتی صورتحال کو نہایت خوبی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔رشید امجد کا اسلوب منفرد ہے۔ان کے ابتدائی مجموعے "کاغذ کی فصیل میں" روایت اور جدت کی آمیزش نظر آتی ہے۔ "سناٹا بولتا ہے"، عکس تماشا عکس، بے ثمر عذاب، سمندر مجھے بلاتا ہے، جنگل شہر ہوئے، بے پانی کی بارش اور گمشدہ آواز کی دستک اس سلسلے کی چند مثالیں ہیں۔تکنیکی حوالے سے ان کے افسانے تجریدی اور علامتی ہیں۔اسلوب پر انھیں پوری طرح

گرفت حاصل ہے۔اردو افسانے کو ایک نیا اسلوب اور نئی زبان دینے میں رشید امجد کو بہت محنت کرنا پڑی۔ان کے نثری اسلوب میں شاعرانہ اسلوب کے لہجے کا تاثر ملتا ہے۔رشید امجد کہانی کی تکنیک، فنی معیارات کو منفرد اسلوب میں ڈھالنے میں ایک اہم نام ہیں۔علامتی اسلوب میں رشید امجد کو انفرادی مقام حاصل ہے۔انھوں نے اپنے عہد کے آشوب اور سیاسی صورتحال کو نمایاں انداز میں پیش کیا ہے۔

مسعود اشعر:

مسعود اشعر نے اپنے افسانوں میں تہذیبی، مذہبی اور اپنے عہد سے متعلق علامتیں استعمال کیں۔یہی وجہ ہے کہ انکا انداز تحریر انتظار حسین کے انداز بیان سے ملتا جلتا محسوس ہوتا ہے۔تقسیم کے بعد کے حالات، کرب، بکھرا ہوا معاشرہ اور جو ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا عمل سامنے آیا اسے مسعود اشعر نے بڑی خوبصورتی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔انھوں نے اپنے اظہار فکر کے لیے اپنے عہد اور تہذیب ومذہب سے علامتیں استعمال کیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں تلمیح، محاکات اور قرآنی آیات واقوال کو بھی موضوع قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔بقول ڈاکٹر اعجاز راہی:

> مسعود اشعر کا افسانوی خمیر تہذیبی اور مذہبی علامتوں سے اٹھتا ہے چنانچہ علامتوں کا ماورائی آہنگ افسانے میں خوابیدگی کی ایک صورتحال کو ابھارتا ہے۔[۶]

مسعود اشعر بھی انہی افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔جنھوں نے ستر کی دہائی میں اپنے آپ کو منوا لیا تھا۔مسعود اشعر ان افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جن کی ملکی وسیاسی حالات پر گہری نظر تھی۔ان کے افسانوں کے موضوعات سیاسی حالات سے سامنے آنے والے شدت کرب اور معاشی رویوں کے عکاس ہیں۔اس مجموعے میں مارشل لاء اور سیاسی جبریت پر لکھے گئے افسانے ان کی فنی مہارت کے غماز ہیں۔اس مجموعے میں شامل اہم افسانے "بچھڑے کا گیت"،"خواب"،"سفر نامہ"،"بتاشوں پر چلنے والی"،"خوابوں کی زندانی"، خاموش۳، ۲ اور ایکبڑی کہانی کا ورک نوٹس وغیرہ ہیں۔افسانہ "بچھڑے کا گیت" میں علامتی انداز میں سیاسی جبر کو بیان کیا گیا ہے۔اگرچہ انھوں نے دوسروں کی نسبت کم لکھا ہے لیکن ان کے افسانے ان کی فنکارانہ ہنر مندی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ان کے افسانے ان کے عمدہ علامتی اسلوب کے عکاس ہیں۔ان کے جدید علامتی افسانے ان کی فکری سوچ کے عکاس ہیں۔ان کے افسانوں میں تہذیب کی شناخت کا احساس بہت زیادہ نظر آتا ہے۔تہذیبی اثرات ان کے اسلوب میں نمایاں ہیں۔

محمد منشا یاد:

محمد منشا یاد کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔جنھوں نے اپنے افسانے کا آغاز روایتی افسانے سے کیا۔ان کے ابتدائی افسانوں میں روایتی عناصر دکھائی دیتے ہیں۔۱۹۶۰ء کے بعد افسانے میں ایک نئے رجحان جدیدیت کا آغاز ہوا تو منشا یاد نے بھی جدید افسانے کی تحریک سے تعلق جوڑا اور جدیدیت کے موضوع کو اپناتےہوئے خوبصورت افسانے پیش کیے۔محمد منشا یاد کے افسانے انفرادیت کے حامل ہیں۔جدید رنگ اختیار کرنے کے باوجود ان کے افسانوں میں کلاسیکی رنگ جھلکتا ہے

اور ان کا یہی آہنگ انھیں دوسرے لکھنے والوں میں انفرادیت بخشتا ہے۔منشا یاد کے ہاں روایتی اور جدید دونوں طرح کے موضوعات ملتے ہیں۔ان کا پہلا مجموعہ "بند مٹھی میں جگنو" میں بھی دونوں طرح کے افسانے شامل ہیں۔انھوں نے روایتی افسانے کے ساتھ ساتھ نیم علامتی افسانے بھی لکھے۔پھر علامتی اور استعاراتی افسانے بھی تحریر کیے۔بقول انتظار حسین:

> منشا یاد نے جس زمانے میں آنکھ کھولی وہ بڑا تجریدی اور علامتی افسانے کا دور تھا اور اس میں بڑی چمک دم تھی اور نقادوں کی طرف سے تجریدی افسانے کو خراج تحسین پیش کیا جا رہا تھا مگر نقاد کسی کا ہو کر نہیں رہتا۔مزے کی بات یہ ہے کہ اس تجریدی افسانے پر انہی نقادوں نے لاٹھی چارج کیا کہ کہانی کہاں غائب ہو گئی ہے۔اب اگر اس دور میں آپ کو کہانی تلاش کرنی ہے تو وہ منشا یاد ہی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بعض کو دیکھ کر کہانی بھاگی اور منشا یاد کی انگلی پکڑ کر واپس آئی۔(۷)

منشا یاد بات کہنے کے فن میں اس طرح مہارت رکھتے ہیں کہ ہر مشکل سے مشکل بات آسانی سے کہہ دیتے ہیں۔منشا یاد نے اپنے افسانوں میں روایتی اسلوب اپنایا ہو یا جدید تکنیک استعمال کی ہو۔ان کے افسانے حقیقت پسندی کے ترجمان ہیں۔منشا یاد نے سوچ کو الفاظ کے روپ میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ان کے الفاظ تصویر کی صورت نظر آتے ہیں۔منشا یاد کے زیادہ تر افسانے دیہات کے پس منظر میں ہیں۔انھوں نے دیہات کی غربت ومحرومیت، قتل وغارت، استحصال کو اپنے افسانوں میں واضح کیا ہے۔ان کے افسانے "دیوار گریہ" میں جاگیرداروں کے ظلم وستم اور بے انصافی کو موضوع بنایا گیا ہے۔منشا یاد نے سیاسی جبر وظلم اپنے افسانے "دھوپ، دھوپ، دھوپ" میں نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔منشا یاد کا تمثیلی افسانہ "تماشا" مارشل لاء کے دور میں لکھا گیا ہے یہ افسانہ سیاسی شعور کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔جبر ان کے افسانوں کا اہم موضوع ہے۔"سورج کی تلاش" مکمل علامتی کہانی ہے۔اس افسانے میں سورج قوت اور سچائی کی علامت ہے۔اس میں زندگی کا فلسفہ ہے کہ جو لوگ راستے کی مشکلات سے گھبرا کر بھاگتے نہیں بلکہ ثابت قدم رہ کر تگ ودو کرتے ہیں اور امید کا دامن نہیں چھوڑتے تو وہی روشنی سے فیضاب ہوتے ہیں۔

اعجاز راہی:

اعجاز راہی جدید افسانہ نگاروں کے اس قبیلے کے نمائندے ہیں جنھوں نے جدت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔اعجاز راہی نے بھی اپنی افسانہ نگاری کی ابتداء روایتی اسلوب سے کی مگر جلد ہی علامتی اسلوب کی طرف راغب ہو گئے۔اعجاز راہی نے اپنے افسانوں میں علامت تجرید، اور استعارے کے ذریعے اپنے عہد کے مسائل کو پیش کیا۔انھوں نے اپنے عہد کے سامراجی نظام وجبر کے خلاف قلم اٹھایا اور کئی ایک کہانیاں لکھیں۔۱۹۷۳ء میں "تیسری ہجرت" کے نام سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ منظر عام پر آیا۔ان کہانیو ں میں اعجاز راہی نے ایسا علامتی وتجریدی اور استعاراتی اسلوب اختیار کیا۔جس نے ساٹھ اور ستر کی دہائی میں پاکستانی سماج کی تصویر کشی کی اور اس دور میں جو جبری ماحول تھا انھوں نے اسے اپنے

افسانوں میں پیش کیا۔ان کے افسانے اس دور کے فرد اور معاشرے کے بہترین عکاس ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں معاشرے کی حقیقی تصویر کھینچی ہے

اگرچہ اعجاز راہی ترقی پسند تحریک سے منسلک تھے۔مگر انھوں نے موضوع اور اسلوب کا نیا لبادہ اوڑھ کر خود کو اپنے دور کے جدید افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔سماجی انتشار کے شکار افراد کی ذہنی اور باطنی کیفیت ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔مجموعہ تیسری ہجرت میں شامل افسانے اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے منفرد تھے۔"تیسری ہجرت" کا بنیادی موضوع سیاسی گھٹن، جبریت، آمرانہ نظام ہے۔"تیسری ہجرت" کے بعد اعجاز راہی کا ایک اور اہم مجموعہ "گواہی" ہے۔یہ مجموعہ انھوں نے تیسرے مارشل لاء کے دوران ۱۹۷۷ء میں مرتب کیا۔انھوں نے سیاسی جبر سے متاثرہ معاشرے کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔مزاحمت اور احتجاج کے اس رجحان کو جو اس دور کے تقریباً سبھی افسانہ نگاروں کے ہاں ملتا ہے۔اعجاز راہی کو ان کے منفرد اسلوب کی بنا پر دوسرے افسانہ نگاروں میں منفرد مقام حاصل ہے۔جبر کے ماحول کی عکاسی میں ان کا تجربہ ذاتی ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد بھی ہے۔"نزار لمحوں کی کی لاثاب داستان" یہ علامتی افسانہ مارشل لاء کے دور میں ہونے والے ظلم وجبر کی کہانی پیش کرتا ہے۔اعجاز راہی نے فنی اور فکری سطح پر افسانے کو ایک نیا رنگ دیا۔

اسد محمد خان:

اسد محمد خان کا تخلیقی سفر مزاحمت، احتجاج اور جبریت کے خلاف غم وغصہ سے ابھرتا ہے۔اسد محمد خان کا شمار ان جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے گردوپیش میں ہونے والی روز بروز تبدیلیوں سے متاثر معاشرے کی صورتحال کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔اسد محمد خان کے افسانوں میں ایک ٹھہرائو نظر آتا ہے ان کے افسانے حقیقت نگاری کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔اسی مجموعے کے افسانوں میں اسد محمد خان نے سیاسی وسماجی صورتحال پر طنز کیا ہے اور عہد کی سفاک حقیقتوں کی نہایت عمدگی سے عکاسی کی ہے۔اس مجموعے میں نظمیں بھی شامل ہیں اس میں تیرہ افسانے اور اڑتیس نظمیں شامل ہیں۔اس کے علاوہ برج خموشیاں، غصے کی نئی فصیل، نربدا اور دوسری کہانیاں اور تیسرے پہر کی کہانیاں شامل ہیں۔مجموعہ "تیسرے پہر کی کہانیاں" حقیقت نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔بقول مرزا مبین:

> "تیسرے پہر کی کہانیاں" میں اسد محمد خان کا فن اس منزل پہ ہے جہاں افسانے اور حقیقت کے مابین امتیاز ممکن نہیں رہتا۔پڑھنے والے کے افسانہ حقیقت بن جاتا ہے اور حقیقت افسانہ ہو جاتی ہے"۔(۸)

اسد محمد خان کے افسانوں میں ظلم استحصال کے خلاف احتجاج نظر آتا ہے۔ان کے افسانے اردگرد کی زندگی کی صرف تصویریں ہی نہیں ہیں بلکہ فکری سطح پر ایک گہرے مشاہدے کا نچوڑ ہیں۔ان کی سب سے بڑی تمنا اپنے عہد کے افراد اور معاشرے کو بہتر شکل میں دیکھنا ہے۔

سمیع آہوجا:

سمیع آہوجا بھی اسی دہائی میں سامنے آنے والے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔سمیع آہوجا کی شناخت ان کیمنفرد اسلوب کی مرہون منت ہے۔سمیع آہوجا کے افسانوں میں حیران کر دینے والا عنصر ان کا جدید اسلوب ہے۔ان کا جدید اسلوب ترقی پسند سوچ کا عکاس ہے۔رمزیت اور علامتیت کو انھوں نے جس طرح اپنے افسانوں میں پیش کیا اس نے ہر قدم پر ان کے فن کو نکھار بخشا ہے۔ان کے ہاں جدید افسانے کا بہترین انداز ملتا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ان کے تیسری دنیا خصوصاً فلسطین کے حوالے سے جو افسانے سامنے آئے وہ سامراجی تشدد کے بہترین عکاس ہیں۔فلسطین کے لوگوں کے حق میں اور سامراجی قوتوں کے خلاف انھوں نے بھرپور انداز میں لکھا۔ایسے نقوش سمیع آہوجا کے افسانوں میں بار بار ملتے ہیں۔انھوں نے اپنے اسلوب کو احتجاج کی شکل میں پیش کیا ہے۔ان کے اسلوب کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے طویل اور مسلسل استعارہ سازی، تشبیہات وعلامات اور رموز واو قاف کا آزادانہ استعمال پیش کیا ہے۔"جہنم+میں" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ان کے افسانوں کی زبان بے بسی ومظلومی، احتجاج وبغاوت، جبر واستحصال، استعاروں، تمثیلوں اور علامتوں کا مجموعہ ہے۔جدید افسانے میں علامت واستعارہ سازی کا رجحان تھا اور علامت نگاروں نے علامتیت ہی کو مقصود سمجھا۔ڈاکٹر رشید امجد سمیع آہوجا کے افسانوں کی زبان کے متعلق لکھتے ہیں:

> جدید اظہاری رویوں یعنی پیکر تراشی اور حسیات کی شناخت کے عمل سے لے کر لوک دانش سے فیض یاب ہونے کی تمام صورتیں شامل ہیں۔کہانیوں کی بنت کاری میں جدید علامتی افسانے کے ارتقائی عمل کا واضح شعور سمیع آہوجہ کو جدید علامتی وتجریدی کہانی کاروں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام عطا کرتا ہے۔[۹]

زاہدہ حنا:

زاہدہ حنا کا شمار ان باشعور خواتین میں ہوتا ہے جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھیں۔زاہدہ حنا ایک نظریاتی افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آئیں۔انھوں نے برصغیر کے سیاسی بحران کو تاریخی زوال کے حوالے سے دیکھا اور اپنے افسانوں میں پیش کیا۔زاہدہ حنا نے معاشرے میں ہونے والی بہت سی ناانصافیوں کی تصویر کشی نہایت نمایاں انداز میں کی۔زمانے کی ستم ظریفی کو انھوں نے اپنے دیگر افسانوں میں بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔زاہدہ حنا کا اسلوب منفرد ہے. ان کے افسانے "تتلیاں ڈھونڈنے والی"،"رنگ تمام خوں شد"،"جسم وزبان کی موت سے پہلے" اور "آخری بوند کی خوشبو" ایسے افسانے ہیں جن میں جبر، ظلم کی چکی میں پسنے والے لوگوں کی داستان الم، دہشت گردی کو پیش کیا گیا ہے۔ان کے کردار مایوسی کا شکار نظر نہیں آتے بلکہ بے بسی کے خلاف جہاد کرتے نظر آتے ہیں۔بقول ڈاکٹر مرزا حامد بیگ:

> آج کی انٹلکچوئل عورت کے نزدیک وصال ایک شفاف ندی ہے۔جس کے اندر کوئی رمز نہیں اور اس کے مقابل فراق جان لیوا ہے۔لیکن اسرار سے پُر سمندر کی مانند خوبصورت،یوں راہ کا

چنائو فراق ہے۔زاہدہ حنا کے افسانوں میں وجودیت کے فلسفے کے زیر اثر ہمارے عہد کی مغربی انسانی جدوجہد کی خاص معنویت ہے اور وجودی سطح پر عورت اور مرد کا ازلی تنازع توجہ کا طالب۔(۱۰)

احمد داؤد:

احمد داؤد اردو افسانے کی دنیا کا ایک اہم اور معتبر نام ہے۔احمد دائود ایک نظریاتی افسانہ نگار کے طور پر سامنے آئے۔احمد دائود نے جس دور میں افسانہ نگاری شروع کی وہ سیاسی جبر کا زمانہ ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کی کہانیاں بیان کی ہیں۔اپنے افسانوں میں انھوں نے اپنے عہد کے سیاسی سماجی ماحول، مارشل لاء کا جبر، سیاسی گھٹن کو بہت اچھے طریقے سے پیش کیا ہے۔سیاسی جبر، جاگیرداری نظام، آمریت اور استعاریت کے خلاف احتجاج احمد دائود کے افسانوں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ان کے افسانے منافقت وخودغرضی اور معاشرے کے کچلے ہوئے افراد کے دکھوں کی واضح تصویر ہیں۔احمد دائود کے افسانوں میں تہذیبی زوال اور سیاسی پس منظر نمایاں ہے۔ڈاکٹر اعجاز راہی کے مطابق:

> احمد داؤد اپنی کہانیوں کو علامتی پیکروں اور منظر نگاری کے جدید رویوں سے بنتا ہے اس کی کہانیوں کے کردار عہد حاضر کی اوپری سطح سے گزر کر انسانی لاشعور کی گہرائیوں سے ہوتے ہوئے بے بضاعتی کے عہد میں اپنی شناخت، نوعمل مکمل کرتے ہیں۔(۱۱)

احمد داؤد کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔جن کے افسانوں کی اکثریت میں سیاسی جبر و گھٹن اور استحصال کی دیگر قوتوں کے خلاف احتجاج نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔انھوں نے اپنے افسانے "وسکی اور پرندے کا گوشت" میں علامتوں کے ذریعے ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کو بیان کیا ہے کہ ان کے ہاں تشبیہ، استعارہ، علامت اور تمثیل جیسے عناصر ان کے اسلوب کو منفرد حیثیت بخشتے ہیں۔انھوں نے اپنی کہانیوں کو علامتی پیکروں اور منظر نگاری کے جدید رویوں سے سجایا ہے۔

مرزا حامد بیگ:

مرزا حامد بیگ بھی ۱۹۷۰ء کی دہائی میں لکھنے والوں میں ایک اہم افسانہ نگار کے طور پر ابھرے۔مرزا حامد بیگ نے ایسے افسانے تحریر کیے جو ماضی کے حالات وواقعات، تجربات اور احساسات کو جدید علامتی واستعاراتی انداز میں سامنے لاتے ہیں۔انھوں نے ماضی کے پس منظر میں حال کی حقیقتوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے ان کا یہی انداز تحریر ہے جو انھیں دوسرے افسانہ نگاروں سے انفرادیت بخشتا ہے۔مرزا حامد بیگ کے ہاں مغل تہذیب کا دورِ زوال پیش منظر کے سماجی وسیاسی ماحول کا ایک علامت اور استعارہ بن کر جھلکتا ہے اور یہی ان کے افسانوں کی بڑی خوبی ہے۔بقول ڈاکٹر اعجاز راہی:

> مرزا حامد بیگ نے مغل تہذیب کے باقیات سے اپنی کہانی کا خمیر اٹھایا اور ایک خاص قسم کے ماحول کو ماضی کے دھندلکوں سے نکال کر عہد جدید کے مسائل اور المیوں سے ہم شناس کیا۔(۱۲)

اسلوب کے اعتبار سے مرزا حامد بیگ کی کہانیاں علامتی واستعاراتی ہیں۔ان کے افسانے مغل سرائے، مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا اور گمشدہ کلمات ایسے افسانے ہیں جن میں واقعات وتجربات کو جدید علامتی واستعاراتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اسلوب کے اعتبار سے مرزا حامد بیگ کی کہانیاں علامتی واستعاراتی ہیں۔افسانہ "مغل سرائے" مغل تہذیب کے تناظر میں لکھی گئی ایک علامتی کہانی ہے۔ان کے افسانے سیاسی شعور سے لبریز نظر آتے ہیں۔انھوں نے اپنے دور حکومت سے متعلق مزاحمتی افسانے لکھے اور اپنے دور کے عصری تنازعہ کو استعاراتی اور علامتی انداز میں بیان کیا کہ ان کے افسانے شہ پارے کا روپ اختیار کر گئے۔

مظہر الاسلام:

مظہر الاسلام نے اپنے فنی سفر کی ابتداء ساٹھ کی دہائی کے آخر میں کی۔انھوں نے روایت پسندی کے ساتھ ساتھ جدت پسندی کو بھی اپنایا۔مظہر الاسلام ایک منفرد اور اپنے مخصوص رنگ میں لکھنے والا ایک بے مثال افسانہ نگارہے۔ان کے بنیادی موضوعات محبت، جدائی، انتظار، تنہائی، اداسی اور موت ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں زندگی کی سچی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ان کے افسانوں میں معاشرے کے دکھ، دھوکا، فریب، جعل سازیاں، محرومیاں، تنہائی وکرب نمایاں صورت میں دکھائی دیتا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں اس حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ بے گناہ عوام کا مذہبی، معاشی، سیاسی غرض ہر سطح پر استحصال ہوتا ہے۔"مٹھی بھر انتظار"،"دھوپ کی منڈیر"،"غیر مطبوعہ بوسہ"،"سوچ پر بیٹھی مکھی"،"پنجرے کی پالی ہوئی بات"،"عذاب پوش پرندے" اور "گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی" ان کی جدت پسندی کے نمائندہ افسانے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک:

> وہ زندگی کے حقائق کو تخیل کی غیر معمولی اڑان کے ساتھ تجریدی سطح پر دیکھتے ہیں۔اس لیے ان کے افسانے تجریدی افسانے ہیں۔مظہر الاسلام کی کہانیوں کا ابہام، انکی طلسماتی فضا، اور عجیب وغریب واقعات بظاہر زندگی سے دور معلوم ہوتے ہیں لیکن درصل یہ زندگی کی وہ سچائیاں اور حقیقتیں ہیں۔جنھیں ہم ذرا سی توجہ سے پہچان لیتے ہیں۔(۱۳)

مظہر الاسلام کا پہلا افسانوی مجموعہ "گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی" ۱۹۸۹ء کے مارشل لاء کے دورانشائع ہونے والا علامتی افسانہ ہے۔اس مجموعے میں شائع ہونے والے افسانے سیاسی گھٹن کے خلاف کھلم کھلا مزاحمت ہیں۔یہ وہ افسانے ہیں جو جدید تر علامتی انداز میں لکھے گئے ہیں۔اس حوالے سے اہم افسانے "متروک آدمی"،"ریت کنارے"،"سانپ گھر"،"ہرا سمندر"،"انا اللہ وانا الیہ راجعون"،"بلائنڈ پرزم"،"کلر کوں کے خواب"،"گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی"،"چور چوری"،"کندھے پر کبوتر" اور "تن لیراں لیراں" وغیرہ۔مظہر الاسلام کے افسانے سیاسی شعور اور فن کا اعلیٰ نمونہ دکھائی

دیتے ہیں۔افسانہ "ریت کنارا" میں معاشرے کی بدلتی قدروں کی عکاسی کی گئی ہے۔"ہرا سمندر" بھی سیاسی شعور کا غماز ہے۔

احمد ہمیش:

انتظار حسین اور سریندر پرکاش کے ساتھ احمد ہمیش کا نام بھی علامتی وتجریدی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔احمد ہمیش ان اولین افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے افسانے میں جدیدیت کی بنیاد ڈالی اور اردو ادب کو نیا جدید افسانہ دیا۔ احمد ہمیش بیانیہ کہانی لکھنے میں اپنا منفرد انداز رکھتے ہیں۔احمد ہمیش کے افسانوں میں اذیت، دکھ، ملال، غصہ، احتجاج، محرومیت، نا انصافی، سیاسی وسماجی جبر کی کیفیات کی واضح تصاویر نظر آتی ہیں۔احمد ہمیش کے افسانوں میں قدیم ہندی کلچر سے لگائو کا تاثر محسوس ہوتا ہے۔۱۹۹۸ء میں "کہانی مجھے لکھتی ہے" چھپا۔اس میں شامل افسانے "مکھی"،"چھپکلی بے دیوار"،"بے زمینی"،"گبر ولا"،"داستان پل اور پش"،"کہانی مجھے لکھتی رہی"،"اگلا جنم"،"ہیں خواب میں ہنوز" وغیرہ ان افسانوں میں انسانی بے بسی دکھائی دیتی ہے۔حقائق کی تلخی، کرب، غریب الوطنی، سیاسی وسماجی جبر، بے زمینی، خوف وڈر کو زندگی کی مختلف جہتوں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔احمد ہمیش کے افسانے "ہیں خواب میں ہنوز" اور "اگلا جنم" میں گہرے المیہ تاثر کے ساتھ انسانی بے بسی اور قدروں کو واضح کیا ہے۔احمد ہمیش کی اشتراکیت اور مذہبیت زدہ ماحول میں پرورش ہوئی اس لیے انھوں نے زندگی کی بدصورتیوں اور تلخ حقیقتوں کو نہایت قریب سے دیکھا اور یہی حقیقتیں، تجربے اور تجزیے ان کے افسانوں میں زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔احمد ہمیش موضوع، مواد اور زبان وبیان کے حوالے سے بھی اپنے عہد کے لکھنے والوں میں منفرد نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سجاد باقر رضوی، دیباچہ۔آخری آدمی، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۶۷ء

۲۔ گوپی چند نارنگ، انتظار حسین کا فن، مشمولہ: اردو افسانہ روایت اور مسائل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص:۵۵۲

۳۔ محمد صادق، ڈاکٹر، ترقی پسند افسانے کے پچاس سال، مشمولہ: ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ص:۳۹۳

۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، نئی اردو کہانی اور خالدہ حسین، مشمولہ: دستاویز، اثبات پبلی کیشنز، راولپنڈی، دسمبر ۱۹۸۵ء، ص:۲۷۱

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، مشمولہ: اوراق، جنوری۔فروری ۱۹۷۹ء، ص:۲۸۹

۶۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر، اردو افسانے میں آہنگ کا اسلوب، ص:۱۶۶

۷۔ انتظار حسین، مشمولہ: ایک عظیم افسانہ نگار: منشا یاد، ڈاکٹر ارشد خانم، ادارہ فروغ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص:۱۶

۸۔ مبین مرزا، فلیپ، تیسرے پہر کی کہانیاں، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۶ء

۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، جہنم میں، احتجاج کا نیا موسم، مشمولہ: سیپ، کراچی، شمارہ ۴۷

۱۰۔ مرزا حامد بیگ، نسوانی آوازیں، سارنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء

۱۱۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر، اردو افسانے میں علامت نگاری، ص:۳۰۱

۱۲۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر، اردو افسانے میں علامت نگاری، ص:۳۰۱

۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، (فلیپ)، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، سیپ پبلی کیشنز کراچی، ۱۹۸۳ء